Al-Mahdi Research Journal (MRJ)
Vol 5 Issue 4 (April-June 2024)
HJRS HEC Journal Recognition System
Category Y
ISSN (Online): 2789-4150
ISSN (Print): 2789-4142

Depictions of Backward Classes in Urdu Novels

اردو ناولوں میں پسماندہ طبقات کی عکاسی

Dr. Muhammad Irfan Ahsan Pasha
Assistant Professor Urdu, Division of Islamic and Oriental Learning, Unviersity of Education, Lahore

Sajjad Ahmad
PhD Scholar, Wifaqi Urdu University, Islamabad

Abu Sufyan
PhD Scholar, Govt. College University, Faisalabad

Abstract

Urdu novels have long served as a powerful mirror reflecting the plight of society's lower strata. The flexibility and scope of the novel form have always captivated writers, allowing them to explore the intricate connections between literature and social realities. This rich tradition features Urdu novelists from various eras who employed satire to expose social ills like the caste system and the stark divide between the wealthy and the underprivileged. Their narratives often depict the powerful as cruel and oppressive, controlling the lives of the poor in every aspect. The wealthy are portrayed as exploiting the impoverished, draining their resources and leaving them in a state of perpetual despair. By highlighting these injustices, Urdu novelists throughout history have shed light on the systemic oppression faced by the lower classes for centuries.

Key Words: Novel, society, satire, caste, Urdu, Poor

پاکستانی اردو ناول جہاں فنی خوبیوں کے حامل ہیں وہاں منفرد اسلوب کے حامل اور موضوعاتی لحاظ سے بھی انسانی زندگی کی مختلف جہتوں کو موضوع بناتے ہوئے دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اردو ناولوں میں خوشی، غمی، سماجی و معاشی ناہمواری، غربت و امارت، ظلم اور جبر سمیت تمام موضوعات کا اہم ترین موضوع پسماندہ طبقات کے مسائل ہیں۔ اس موضوع کو سمجھنے اور اس پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پاکستانی سماج پر بحث کی جائے اور دیکھا جائے کہ سماج کیا ہے؟ اور پاکستانی سماج میں کون کون سے طبقات ہیں اور اس سماج میں کیا کیا معاشی امتیازات پائے جاتے ہیں:

"لفظ سماج کے لغوی معنی معاشرہ سوسائٹی، انجمن، حلقہ، ٹولا یا صف کے ہیں اور یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔"(1)

عمرانیات میں افراد کے باہمی تانے بانے کو معاشرہ کہتے ہیں اور عام طور پر معاشرے سے مراد افراد کا گروہ لیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں معاشرے کے لیے سوسائٹی (Society) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ماہرِ عمرانیات معاشرے کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"A society is a large social grouping that shares the same geographical territory and is subject to the same political authority and dominant cultural expectations."(2)

اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے میں صرف ایک ہی سیاسی گروہ کی اجارہ داری ہے۔ جس کا کنٹرول اس معاشرے کے تمام باشندوں پر لاگو ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایک ہی جغرافیائی خطے کا ہونا ضروری ہے اور ایک ہی سیاسی طاقت کا رعب ہونے کی بھی شرط عائد کی گئی ہے۔ لوگوں کے درمیان ایک جیسی ثقافت کا ہونا بھی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور تعریف میں سیاسی طاقت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا گیا ہے:

"A group of interacting individuals who share the same territory and participate in common culture is called the society."(3)

یہ بات تو ایک حقیقت ٹھہری ہے کہ معاشرہ انسانوں کا ایسا گروہ ہے جو اپنے مفاد اور بقا کے لیے اکٹھے رہتے ہیں۔ عام طور پر علاقائی وقوع پذیری بھی معاشرے کا لازمی عنصر تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عاشق عادل یوں رقم طراز ہیں:

"انسان معاشرے میں رہ کر انسان بنتا ہے ورنہ معاشرے سے باہر وہ حیوان ہی ہے۔ معاشرہ یا سماج کے قیام میں کچھ عناصر فرما ہیں جن کی بنیاد پر سماج قائم رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔"(4)

CC BY

سماج کے قائم رہنے میں سب سے اہم کردار یکسانیت کا ہے۔ یکسانیات کے بغیر سماج کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ لباس، زبان، خیالات، اقدار، عادات، رسومات، عقائد، احساسات اور جذبات و عقائد میں یکسانیت وہ بنیادی اجزا ہیں جو لوگوں کو ایک بندھن میں باندھے رکھتے ہیں۔ انہیں افراد کے بل بوتے پر لوگ آپس میں مل کر گروہ بناتے ہیں اور زندگی کی لذت حاصل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے رسوم و رواج اور عقائد وغیرہ میں یکسانیات، برابری، معاشرے کی پائیداری اور استحکام کا سبب بنتے ہیں۔ سماج میں جیسے یکسانیت ضروری ہے ویسے ہی اختلافات کے باوجود باہمی انحصار بھی لازمی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے سماج میں سماجیت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سماجی رویوں کے بل بوتے پر سماج تشکیل پاتا ہے۔

سماج کی اقسام

1۔ دیہی سماج　　2۔ بلدیاتی سماج　　3۔ خانہ بدوش سماج

4۔ اقامتی سماج　　5۔ روایتی سماج　　6۔ جدید سماج

پس ماندہ طبقات کے مسائل

مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستانی سماج، اعلیٰ و ادنیٰ اور ذات پات کے تفریق کے سبب مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس سماج میں عزت و احترام کا معیار دولت تھا۔ کوئی شخص جتنا زیادہ دولت مند ہوتا اسے اتنا ہی محترم سمجھا جاتا اور اس کا شمار اعلیٰ طبقے میں ہونے لگتا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اقتصادی طور پر کمزور تھے خواہ وہ کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوتے انہیں نچلے طبقے کا آدمی سمجھا جاتا۔ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ طبقے سے وابستہ لوگ سماج میں اہمیت کے حامل ٹھہرے اور محنت مشقت کر کے روزی کمانے والے مزدوروں، کسانوں اور غریب غربا کو نچلے طبقے کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔

انیسویں صدی کے شروع ہونے تک دو واضح طبقات ادنیٰ طبقہ اشرفیہ کی صورت میں اور کسان مزدور نچلے طبقے کی صورت میں تقسیم ہو کر سامنے آچکے تھے۔ بیسویں صدی میں ہندوستانی سماج چار واضح طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ "برہمن" سماج میں مذہبی امور سرانجام دیتے تھے۔ ان کو یہ سماج میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ دوسرا طبقہ "راجن" تھا یہ سماج میں فوجی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ تیسرا طبقہ "ویش" تھا یہ طبقہ سماج میں تجارت و کاروباری معاملات سرانجام دیتا تھا۔ اسی طرح چوتھا طبقہ "شودر" تھا جو ادنیٰ درجے کے تمام کام کرتے تھے۔ اور انہیں اچھوت کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ جس چیز کو ہاتھ لگا دیتے اسے ناپاک سمجھا جاتا۔ اس لحاظ سے ہندوستانی سماج میں ذات پات کو بڑی اہمیت رہی ہے اور اسی ذات پات کے نظام سے استحصال اور خود غرضی نے جنم لیا۔ جس وجہ سے نچلے طبقے کے لوگ زندگی گزارنے کے لیے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ لوگ عمر بھر غلامی کرتے رہتے اور مشکلات کا سامنا کرتے زندگی کے دن پورے کرتے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ہے جو 1869ء میں تخلیق ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے تعلیم و تربیت، عورت کی سلیقہ مندی، اطاعت شعاری اور مذہبی وابستگی کا درس دیا۔ اسی طرح "توبۃ النصوح" اور "فسانہ مبتلا" میں متوسط و نچلے طبقے کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ "توبۃ النصوح" میں ایک متوسط طبقے کی کہانی ہے جہاں ایک امیر گھر کا نوجوان نصوح مرزا ظاہر دار بیگ جیسے اقدار سے عاری شخص کی دوستی میں گھر سے نکلا ہے اور رات مسجد میں گزارنا پڑتی ہے۔ "فسانہ مبتلا" میں پرانا جاگیر دار طبقہ دکھایا گیا ہے۔ بقول مولانا صلاح الدین احمد:

"مولوی صاحب نے مراۃ العروس اور اس کے بعد آنے والے ناولوں کے ذریعے سے اوسط درجے کے مسلمان گھرانوں کے سامنے ترقی اور خوشحالی کے نئے افق پیش کیے۔ اور انہیں اپنی اصلاح معاشرت اور تدبیر منزل کی طرف توجہ دلائی۔"(5)

پہلی جنگِ عظیم کے بعد پوری دنیا کا منظر نامہ تبدیل ہوا تو ہندوستان پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ ملک میں مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں چلیں۔ اردو ناول میں حقیقت نگاری شروع ہو گئی۔ خاص طور پر انقلابِ روس نے حقیقت نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ حقیقت نگاری کے بھی منشی پریم چند کے شہرہ آفاق ناول 1920ء کے بعد تخلیق ہوئے۔ اس دور کے ناولوں میں پریم چند نے جاگیر دارانہ، سرمایہ دارانہ اور لوگ کھسوٹ کو سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں مزدوروں اور کسانوں کے ہونے والے استحصال اور لوٹ مار کے خلاف واضح آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ناول، "گوشۂ عافیت" میں اگرچہ اس موضوع کا اظہار قدرے کم ہے مگر "گئودان"، "میدانِ عمل" اور "چوگانِ ہستی" میں واضح جھلک نظر آتی ہے۔ "گوشۂ عافیت" میں پہلی بار شمالی ہند کے مظلوم اور غریب کسانوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ناول کا ہیرو بلراج زمینداروں اور ان کے حواریوں سے ٹکر لینے والا ایک باغی نوجوان ہے۔

"گوشہ عافیت" کے حوالے سے ڈاکٹر افضال بٹ کہتے ہیں:

"پریم چند کے اس ناول کا اصل موضوع کسانوں کی زندگی کی عکاسی کرنا ہے۔ جس میں کسان کی سماجی اور معاشی زندگی کے تمام پہلو نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہر طبقے کے افراد کی ذہنی اور سماجی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ کسانوں اور زمینداروں دونوں طبقات کے حالات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔"(6)

"چوگانِ ہستی" پریم چند کا ضخیم ناول ہے۔ 1924ء میں شائع ہوا۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی عروج پر پہنچنے کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ "چوگانِ ہستی" گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ سورداس ہندوستانی کسان کے جذبات و احساسات کا ترجمان نظر آتا ہے اور حریت پسند کی علامت ہے۔ ایک سرمایہ دار غریب سورداس کی زمین پر قبضہ کر کے وہاں اپنی مل لگانا چاہتا ہے۔ مگر سورداس مزاحمت کرتا ہے۔ یہ ناول دراصل انہیں دو کرداروں کے درمیان کھینچا تانی اور لڑائی جھگڑے پر مشتمل ہے۔

CC BY

سورداس کے طبقے سے تعلق رکھنے والے نانک رام، سوبھاگی اور بجرنگ بھی غریب اور پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس ناول میں ہندوستان کی اندرونی ریاستوں کی بھی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ پریم چند اس ناول کو اپنا بہترین ناول قرار دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

"پریم چند نے سوشلزم اور ترقی پسند ادب کے منشور اور تحریک سے کہیں پہلے ترقی پسندانہ اندازِ تحریر اپنایا۔ یوں وہ ترقی پسندوں کا ہراول قرار پاتے ہیں اور یہ ایسا اعزاز ہے جو بذاتِ خود اہم ہے۔"(7)

پریم چند کے ناول "میدانِ عمل" 1930ء میں لکھا گیا۔ ہندوستان میں جاری تحریک آزادی کا مطالعہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ 1930ء کے بعد تحریکِ آزادی شدت واختیار کر گئی۔ اس دور میں سول نافرمانی، غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ اور سرکاری ملازمتوں سے استعفے دینے جیسے واقات رونما ہوئے۔ پریم چند نے اس ناول میں اس دور کی پیچیدگی اور سیاسی ہلچل کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔

ناول "میدانِ عمل" کا ہیرو ایک قوم پرست اور حریف پسند نوجوان ہے جس کا نام امرکانت ہے۔ امرکانت گاندھی جی کے فلسفے کا قائل ہے۔ اسی وجہ سے امرکبیر والد کا ساتھ چھوڑ کر کھدر بیچنا شروع کر دیتا ہے۔ امرکانت ایک گاؤں میں ڈیرہ ڈال کر لوگوں کو حصولِ تعلیم پر آمادہ کرتا ہے اور مقامی زمیندار کے خلاف بھڑکاتا ہے اور کانت کی ایک چھوٹی بہن کی شادی جس گاؤں میں ہوتی ہے وہاں ایک نیچ ذات کی عورت منی کی انگریز عصمت دری کرتے ہیں۔ وہ تین انگریزوں کو قتل کر دیتی ہے تو اسے جیل جانا پڑتا ہے۔ امرکانت اور ڈاکٹر شانتی کانت اس کیس کی پیروی کرتے ہیں اور منی کو رہائی مل جاتی ہے۔ سکھاں امرکانت کی بیوی ہے اور اس کے کردار پر شک کرتی ہے۔ امرکانت تنگ آکر گاؤں چھوڑ کر اچھوتوں کی بستی میں قیام کرتا ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ اچھوتوں کی بدحالی، کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ بقول ڈاکٹر خالد اشرف:

"میدانِ عمل میں پریم چند نے شہری زندگی کو بھی پیش کیا لیکن دیہات کے سادہ لوح کسانوں اور جاگیرداروں کی معاشی و نفسیاتی زندگی، ان کی توہمات و تعصّبات، ان کی چھوٹی چھوٹی چالاکیوں، ان کی مذہبیت، رحم دلی اور ان کے فرسودہ رسوم ورواج کی پیشکش میں مہارت سے کی گئی ہے۔ وہی مہارت شہری مزاجوں اور کرداروں کے ضمن میں نظر آتی۔"(8)

"گئودان" پریم چند کا سب سے اہم اور مشہور ناول ہے جو 1936ء میں شائع ہوا۔ اس وقت شاید گاندھی جی کے عوام تشدد اور جاگیرداروں سے مفاہمت پرستانہ ذہنیت سے پریم چند مایوس ہو چکے تھے۔ اس لیے اس ناول کا کوئی کردار اپنا گھر بار چھوڑ کر سماج کی خدمت کے لیے جاتا نظر نہیں آتا اور نہ ہی کوئی رئیس جاگیردار یا زمیندار اپنی زمین، غریبوں میں تقسیم کرتا نظر آتا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے ایک حقیقت پسندانہ ادیب کی طرح ہندوستانی سماج میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کی تمام گوشوں کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کا ہیرو ہوری ایک کمزور، مظلوم، جاہل اور پسماندہ کسان ہے جو فکشن کے ساتھ روایات سے بغاوت کی ایک واضح جھلک ہے۔ ہوری کا کردار ایک ایسے شخص کا کردار ہے جو معمولی خواہشات اور قلیل ضرورتوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے نہ تو سیاست سے دلچسپی ہے اور نہ ہی ٹریڈ یونین کے مزدوروں کی طرح اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ دوسری جانب اس کا بیٹا گوہر دیہی زندگی کے مسائل سے گھبرا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ جہاں فیکٹری میں کام کر کے پیٹ کا ایندھن بھی پورا کرتا ہے اور گاؤں کے لوگ اس کی عزت بھی کرنے لگتے ہیں۔ وہ تحریکِ آزادی میں بھی حصہ لیتا ہے اور مزدوروں کے احتجاج میں بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح قسمت پرست نہیں بلکہ اپنی قسمت اور حالات کو بدلنے کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔ ناول نگار ایک طرف تو زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کسانوں، مظلوموں کے استحصال کی عکاسی کی ہے تو دوسری جانب سرمایہ دار طبقہ کے ہتھکنڈوں کو بھی عیاں کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر افضال بٹ:

"ہوری کی موت اس کی ذات کی موت نہیں بلکہ کروڑوں ہندوستانی کسانوں کی موت ہے۔ وہ کسان جو استحصال زدہ سماج میں رہتے ہوئے اپنی آرزوں اور امنگوں کو پورا نہیں کر سکے۔ کسانوں کے جاگیرداری اور مہاجن طبقے کی لوٹ کھسوٹ سے نجات حاصل کرنے کا واحد حل ہوتا ہے۔"(9)

اردو ناول نذیر احمد، راشدالخیری، عبدالحلیم شرر، ہادی رسوا اور پریم چند میں ہوتا ہوا ترقی پسندوں تک پہنچا۔ تو بڑی حد تک حقیقت پسندی اس میں داخل ہو چکی تھی۔ خاص طور پر پریم چند نے غریب کسان اور پسماندہ طبقہ کے مسائل کی عکاسی کر کے ترقی پسندوں کی راہ ہموار کر دی تھی۔

جہاں تک ترقی پسند ادب کی واضح تعریف کی بات ہے تو اس حوالہ سے معروف نقاد ممتاز شیریں کی رائے ہے:

"وہ ادب جو زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرے، جس میں زندگی کی تفسیر ہی نہیں تنقید بھی ہو اور جس میں زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہو۔"(10)

عصمت چغتائی کا ناول "ضدی" 1948ء میں شائع ہوا۔ اس سے ناول نگار نے پورن اور آشا کی محبت کے پس منظر میں بتایا ہے کہ جاگیردار طبقہ اس طرح سخت گیری، سماجی درجہ بندی اور چھوٹے پندار کی وجہ میں غریب اور پسماندہ طبقہ سے رشتہ داری قبول نہیں کرتے۔ پورن جاگیردار گھرانے کا چشم وچراغ ہے۔ آشا اس کی ہم عمر مگر نوکر پیشہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ پورن کو یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کا روشن خیال باپ س کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا، مگر اس کے ماں باپ کو بھی ساتھ ملا لیتی ہے اور دونوں کی محبت کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے۔ آشا کو پورن کی بہن کملا کے سسرال بھیج دیا جاتا ہے اور پورن کی شادی شانتا سے کر دی جاتی ہے۔ پورن شانتا میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ مہیش میں دلچسپی لینا شروع کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مراسم بہت آگے تک چلے جاتے ہیں۔ جب پورن یہ کہا جاتا ہے کہ اسے مہیش کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھانے سے روکو۔ آخر تمہاری بیوی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ پنڈتوں کے آٹرم شرم سے تو میری بیوی ہے مگر اسے پریم نہیں دے سکتا تو اسے دوسرے سے پیار کرنے سے کیسے روک سکتا ہوں۔ پورن عشق میں ناکامی کے سبب بیمار ہو جاتا ہے۔ جب تمام علاج بے سود ثابت ہوتے ہیں تو آشا کو اس کی تیمارداری کے لیے گاؤں سے بلایا جاتا ہے۔ پورن آشا کو اپنی باہوں میں لے کر پرسکون ہو جاتا ہے اور ابدی نیند سو جاتا ہے۔

جب کہ آشا بھی اپنے آپ کو آگ لگا کر زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر افضال بٹ:

"عصمت چغتائی نے پورے ناول میں پورن اور آشا کی محبت کے لیے ذات پات کے فرق کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دور زمیندار کا دور تھا وہ اس دور کو بڑے قریب سے دیکھ رہی تھی کس طرح اعلیٰ طبقہ، نچلے طبقے کو اپنے جبر کا شکار بناتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ غریبوں سے اپنی خدمت کرواتا ہے اور اس کے جذبے میں ان کے جذبات کو کچلتا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اعلیٰ طبقے کی نظر میں ادنیٰ طبقے کی کوئی عزت نہیں۔ نہ کوئی حیثیت جب کہ دوسری طرف سماج کا یہ طبقہ اپنی ساری زندگی ان کی خدمات کے لیے وقف کر دیتا ہے۔"(11)

عزیز احمد کا نام بھی معروف ناول نگاروں میں شامل ہے۔ ان کا پہلا ناول "ہوس" 1932ء میں شائع ہوا۔ یہ فرانسیسی اور انگریزی رومان نگاروں کی پیروی میں لکھا جانے والا ایک عام سا ناول ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ پردے کی پابندی کرنے والی لڑکیاں رد عمل کے طور پر مردوں کے پھیلائے جال میں آپھنستی ہیں۔ عزیز احمد کا یہ ناول ایک اصلاحی رنگ لیے ہوئے ہے۔

ناول کا ہیرو جدید تعلیم یافتہ نوجوان سلیم ہے جو بمبئی میں اپنے چچا کے ہاں قیام کے لیے آتا ہے۔ اس کے چچا کی بیٹیاں زلیخا اور سلیمہ پردے کی سخت پابندی کرتی ہیں۔ زلیخا سلیم میں دلچسپی لیتی ہے اور رفتہ رفتہ دونوں کے جبلی تقاضے رنگ لاتے ہیں۔ زلیخا حاملہ ہو جاتی ہے اور راز فاش ہونے پر اس کے ماں باپ اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتے اور مر جاتے ہیں۔ بعد میں زلیخا کی شادی نسیم کے بڑے بھائی سے ہو جاتی ہے۔ نسیم کی شادی سلیمہ سے ہو جاتی ہے جو ایک رشتے دار کے بچے کی ماں بننے والی ہے نسیم باامر مجبوری اس بچے کو قبول کر لیتا ہے۔ قبول پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف:

"مصنف اس کہانی کا سبق یوں دیتا ہے۔ پردے کی مجبوری سے نوجوان لڑکے لڑکیاں صرف اپنے قریبی رشتے داروں سے مل سکتے ہیں اور ملنے کا مقصد ان کے نزدیک جنسی ملاپ ہوتا ہے۔ یوں ان کا ذہن خفتہ اور جسم اچانک بے دار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا المناک صورتِ حال رونما ہوتی ہے۔"(12)

ناول نگار نے دیباچہ میں ناول کی فنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہوس" بڑی حد تک زمانہ جاہلیت کے آثار سے بھری پڑی ہے۔

عزیز احمد کا ناول "گریز" 1943ء میں چھپا۔ یہ ایک نئے بھرتی ہونے والے آئی سی ایس آفیسر کے گرد گھومتا ہے اور اس میں ہندوستانی نوجوانوں کی باہر کے ممالک میں جا کر مصروفیات اور دلچسپی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں پسماندہ طبقہ کی عکاسی واضح نظر نہیں آتی۔ تاہم 1946ء میں چھپنے والے ناول "آگ" میں عزیز احمد نے کشمیری عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم، ان کی بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت اور کشمیری عوام کی غربت و پسماندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احمد افضال بٹ یوں رقم طراز ہیں:

"ناول نگار نے انسانی زندگی کی اضطرابی اور بے چینی کو دکھایا ہے۔ جو اس وقت کے موجودہ نظام کی پیدا کردہ ہے۔ "آگ" میں وہاں کے جنسی استحصال، مفلسی، غربت، بھوک اور نچلے طبقے کی زندگی کو آشکار کیا گیا ہے۔"(13)

آگ میں عزیز احمد نے بیسویں صدی کی ابتدا سے قیام پاکستان تک کے دور کو احاطہ کیا ہے۔ ناول نگار نے ناول میں اس دور کی سیاسی تحریکات اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی آزادی کے حوالے سے جدوجہد کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر کے پاس منظر میں لکھنے جانے والے اس ناول میں ایک مالدار تاجر سکندر اہم کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے عزیز احمد نے بتایا ہے کہ کشمیری تاجر اور ڈوگرا شاہی افسران کس کس طرح صدیوں سے غریب، ان پڑھ اور مظلوم کشمیری مزدوروں اور کاریگروں کا استحصال کرتے رہے ہیں اور لوٹ مار کا بازار گرم کر کے انہیں مزید غربت کی دلدل میں پھینکتے رہے ہیں۔ ناول میں ناول نگار نے بہت عمدہ طریقے سے عکاسی کی ہے کہ کس طرح کشمیری عوام اپنی جہالت اور غریبی کی وجہ سے انتہائی غلیظ ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور جانوروں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس غربت اور پسماندگی کی وجہ سے اپنی عورتوں کی عزت کے دام وصول کرنے پر مجبور ہیں۔ ناول میں کشمیری عوام کی غربت و بدحالی اور اس کے پس پشت جاگیر دارانہ نظام اور مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ کے مناظر پیش کر کے ناول نگار نے اہم موضوع کو اجاگر کیا ہے۔ عزیز احمد کی ناول نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف کہتے ہیں:

"وہ بھی کرشن چندر کی طرح ترقی پسند تھے۔ لیکن انہوں نے "گریز" کی طرح "آگ" میں مارکسی حقیقت نگاری کی بجائے نیچرل ازم کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ جنس کے جذبے اور اس کے عملی پہلو پر ان کا زور زیادہ ہے اور منٹو کی طرح کہیں کہیں وہ بھی جنس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔"(14)

عزیز احمد بلاشبہ اپنے عہد کے بہترین ناول نگار ہیں جنہوں نے موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے عمدہ ناول تخلیق کیے۔

کرشن چندر کا نام اگرچہ افسانہ نویس کے طور پر زیادہ مشہور ہے مگر انہوں نے چند بہترین ناول بھی تخلیق کیے۔ ان کے ناول ترقی پسند نظریات اور انسان دوستی کا مظہر ہیں۔ کرشن چندر نے "جب کھیت جاگے"، "ایک عورت ہزار دیوانے"، "ایک گدھے کی سرگزشت"، "دل کی وادیاں سو گئیں"، "مٹی کے صنم"، "اور "شکست" کے نام سے ناول تخلیق کیے مگر ان سب میں "شکست" موضوع کے لحاظ سے دلچسپ اور فنی اعتبار سے مکمل ناول ہے۔ یہ کرشن چندر کا پہلا ناول ہے جو 1943ء میں چھپا اور اس کا موضوع روایتی جاگیر دارانہ سماج کی عکاسی ہے۔

ناول میں بیک وقت دو کہانیوں کو ساتھ ساتھ چلایا گیا ہے۔ ایک کہانی کا ہیرو موہن سنگھ ہے جو چندرا کی محبت میں گرفتار ہے تو دوسری کہانی شیام اور ونتی کے گرد گھومتی ہے۔ کشمیر کی دیہی زندگی سے متعلق اس ناول میں وہاں کے سیاسی و سماجی حالات کی بڑی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ موہن سنگھ راجپوت ہے جب کہ چندرا کا تعلق اچھوتوں سے ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، مگر ظالم سماج ان کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ چندرا ناول کا اہم کردار ہے۔ وہ ایک پر عزم اور مستقل مزاج دوشیزہ ہے جو ایک پسماندہ گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود سماج سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ وہ موہن سنگھ سے محبت کرتی ہے اور اس محبت کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ سے ٹکرانے کیلئے تیار ہے۔ وہ مذہب کے ٹھیکیداروں اور اخلاقیات کے دعوے داروں سے ٹکرانے کیلئے تیار ہے کیونکہ یہی برادری اور سماج اس کی ماں کو ذات سے باہر کر چکے تھے۔ اب اس جرم کی سزا چندرا کو بھگتنا پڑ رہی

CC BY

تھی۔ مذہب کا ٹھیکیدار پنڈت سروپ کش یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ایک راجپوت ایسی عورت سے شادی کرے اور اس کی نسل خراب ہو۔ مگر موہن سنگھ کی موت نے اس کی شخصیت کو توڑ کر رکھ دیا اور آخر کار وہ پاگل ہو جاتی ہے۔ دوسرا نوجوان شیام جو ایک تحصیلدار کا بیٹا ہے جو چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں آتا ہے۔ گاؤں کی میر کے دوران وہ کھیتوں میں جاتا ہے تو کھیتوں میں کام کرنے والی پچھلے طبقے کی عورتوں اور مزدوروں سے ملتا ہے۔ زیادہ تر عورتوں کے شوہر نشہ کے عادی ہیں اور وہ نشہ میں عورتوں کو طلاق تک دے دیتے ہیں۔ زنا بالجبر کے واقعات عام ہیں۔ شیام ان لوگوں سے بات چیت کر کے انہیں حوصلہ دیتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب انہیں سماج میں تحفظ اور مساوی حقوق ملیں گے۔ شیان کو رانی سے محبت ہو جاتی ہے۔ ونتی نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہے جبکہ شیام کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے۔ شیام سماج کی اونچ نیچ کی پرواہ کیے بغیر ونتی سے شادی کا خواہش مند ہے۔ مگر محبت کی خاطر تان سے کر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ونتی کی شادی دوسری جگہ ہو جاتی ہے اور شیام چپ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ جب شیام کی شادی ہونے لگی ہے تو ذوقی کیلئے لمحہ بڑا کر بناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کا محبوب کسی اور عورت کے پہلو میں سوئے۔ وہ اپنی جان دے دیتی ہے اس طرح یہ محبت ناکام ہو جاتی ہے اور سماجی پابندیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بقول ڈاکٹر خالد اشرف:

"کرشن چندر کا یہ ناول ایک حد تک رومانوی اور اصلاحی ہے جو ہندو سماج کی زمانہ قدیم سے مروجہ ذات پات کی درجہ بندی کے خلاف تحریر کیا گیا ہے۔ اس ناول کو اگر ضدی کی رومانیت کی توسیع کہا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ مصنف نے اس ناول میں فطرت کی گود میں جن کرداروں کی زندگی کو ترتیب دیا ہے ان کے گرد فطرت کا حسن اور پاکیزگی کا ہالہ ضرور موجود ہے۔ لیکن وہ سب کے سب نیم مردہ ہیں۔ شکست اور محرومی ان کا مقدر ہے ان کے معصوم خواب جاگیر داری تہذیب کے ظالم شکنجے کی جکڑ میں آکر دم توڑ جاتے ہیں۔ شیام، ونتی، موہن اور چندرا اسب اسی ظلم و جبر کا شکار ہیں اور اسی جبر و اذیت کے خلاف لڑتے لڑتے جان دے دیتے ہیں یا ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔"(15)

کرشن چندر "شکست" کے ذریعے سماج کی پرانی ریتوں کی بجائے نئی سیاسی، سماجی اور اخلاقی تبدیلیوں کے خواہش مند ہیں مگر وہ یہ بھی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ابھی نوجوان نسل میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ پرانی قدروں سے بغاوت کر کے فرسودہ نظام کو شکست دینے کے لیے میدان میں اتریں۔ اس لحاظ سے کرشن چندر کا یہ ناول ایک بہت بڑی کاوش ہے جو ملکی سماجی حالات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ غریب اور پسماندہ طبقے کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔

شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی پاکستانی اردو ناولوں کی فہرست میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں ہمارے معاشرے کے پس ماندہ طبقہ کے مسائل کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ایک معصوم بچے کو چور بناتے ہیں۔ لوگ کیسے غریب اور بیوہ عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ غربت سے جنگ لڑنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ناول میں ہمارے نام نہاد سیاست دانوں کے کردار سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے کہ کس طرح وہ عوام کے ہمدرد بن کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں، ان کے خدمت خلق کے جذبے کے پیچھے بھی مطلب اور مقصد ہوتا ہے۔ وہ مساجد کی تعمیر کرواتے ہیں تو بھی اپنی کمائی کا راستہ نکال لیتے ہیں اور کسی رفاع عامہ کے لیے کام کرنے والے ادارے کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو اُس میں بھی ان کا ذاتی مفاد کار فرما ہوتا ہے۔ ناول نگار نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس معاشرے میں لوگوں سے حقیقی ہمدردی کرنے والوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور غریب عوام کی فلاح کے ادارے قائم کرنے میں کیسے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں۔

ناول نگار نے کراچی جیسے شہر میں سرگرم جرائم پیشہ گروہوں کی کارروائیوں، معصوم بچوں کو آلہ کار بنانے، جیب کتروں کے قوانین اور طریقوں، جیل کے اندرونی حالات کے علاوہ مختلف اداروں میں ترقی کے لئے اختیار کرنے والے طریقوں پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ ناول میں پیسے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے والے خود غرض معاشرے کے افراد سے بھی شناسائی ہوتی ہے تو دولت کے حصول کے لیے گھٹیا حربے استعمال کرنے والے افراد سے بھی متعارف کروایا گیا ہے۔ شوکت صدیقی نے اس ناول میں پیسے لے کر لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کرنے والے ڈاکٹر خیرات محمد عرف موٹو جیسے کردار دکھائے ہیں تو ڈاکٹر زیدی جیسے فرشتہ صفت انسان کو بھی متعارف کروایا ہے جو مریضوں کے علاج معالجہ کے لیے نہ دن دیکھتا ہے اور نہ رات۔ ناول میں نیاز کباڑیے سے نیاز محمد گورنمنٹ کنٹریکٹر تک سفر کرنے والے لالچی، خود غرض اور بے کسی انسان کا کردار ملتا ہے تو عاصم بشیر اور سلمان جیسے لوگ بھی ہیں جو سب کچھ عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لحاظ سے اس ناول کو خاص طور پر اہمیت ہے کہ ناول نگار نے پاکستان کے پس ماندہ طبقوں کے مسائل کو اس ناول میں منفرد اور شاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول نگار نے غریب لوگوں کے بچوں کے لیے ٹیکنکل تعلیم کے ادارے نہ ہونے کے مسئلے کی نشان دہی کی ہے۔ سرکاری سطح پر ایسے ادارے نہ ہونے کی وجہ سے غریب والدین جو اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلوا سکتے مختلف ورکشاپوں میں بھیج دیتے ہیں تاکہ کام سیکھ کر روزی کمانے کے قابل ہو سکیں۔ ان ورکشاپوں میں مستری خود کام کم کرتے ہیں، زیادہ تر کام شاگردوں سے کرواتے ہیں۔ یہ ان پڑھ اور جاہل مستری جنہیں بچے استاد جی کہہ کر پکارتے ہیں شاگردوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سخت سزا دیتے ہیں اور بات بات پر گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ نوشا جس دور کشاپ میں کام کرتا تھا اُس کا مالک بھی اسی کینڈے کا آدمی تھا۔ ایک دن جب نوشا اور ایک دوسرا لڑکا لیٹ آئے تو استاد کو دیکھ کر نوشا گاڑی کے نیچے چھپ گیا اور دوسرا لڑکا استاد کے ہاتھ چڑھ گیا۔ استاد عبداللہ غضب ناک ہو کر چیخنے لگا اور کہا کہ ایک سالوں کو کام سکھاؤ اوپر سے تنخواہ دو اور یہ گھر سے نواب بن کر نکلتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے وہ طریقہ اختیار کیا جو ہر دیر سے آنے والے کے ساتھ اختیار کرتا تھا:

"اس نے ایک کاریگر کے ہاتھ سے پلاس چھینا اور لڑکے کی ناک اس میں رکھ کر زور سے بھینچ دی۔ وہ بلبلا کر چیخا۔۔۔ ہائے مر گیا مستری جی!۔۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔ اب کبھی دیر سے نہیں آؤں گا۔۔۔ وہ برابر چیختا رہا۔ فریاد کرتا رہا۔ مگر عبداللہ نے اس کی ناک نہ چھوڑی۔ جب وہ تکلیف سے بے قابو ہو کر فرش پر ہاتھ پاؤں پٹخنے لگا تو عبداللہ نے ڈانٹا۔ سالے ایسا ایکٹنگ ہو رہا ہے۔۔ وہ تڑپ کر چیخا۔ ارے مر گیا مستری جی۔ اب بھی نہیں کروں گا۔ مستری زور سے گرجا۔ سیدھا بیٹھ۔ لڑکا ایک دم منجل کر بیٹھ گیا۔۔۔ ذرا دیر بعد عبداللہ نے پلاس کے شکنجے سے اُس کی ناک آزاد کر دی۔ اب ناک ٹماٹر کی طرح سرخ نظر آ رہی تھی۔ لڑکا بار بار ناک چھوتا اور زور زور سے سسکیاں بھرتا۔"(16)

ناول میں امیر لوگوں کے چھوٹی عمر میں کام کرنے والے بچوں سے بدتمیزی کے ساتھ پیش آنے کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کسی طرح ان چھوٹے بچوں کو جن کی عمر کھیلنے کی ہوتی ہے مگر معاشی مجبوریوں کے سبب روزی کمانے نکلتے ہیں، ڈانٹا جاتا ہے۔ نوشا کا دوست شامی جو دکان پر جانے سے پہلے اخبار بیچتا تھا جب ایک دن ذرا دیر سے اخبار لے کر پہنچا تو

مالک مکان نے اخبار لینے سے انکار کر دیا اور اسے ڈانٹا۔ شامی نے جب پچھلے بل کا مطالبہ کیا تو اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا کہ بھاگ جاؤ پیسے نہیں ملیں گے۔ چاہیے تو تھا کہ اس کم سن بچے کو پیار اور شفقت سے سمجھایا جاتا مگر جس انداز میں مالک مکان نے بات کی اس سے ہماری سوسائٹی کے غریب بچوں کے ساتھ رویے کی جھلک واضح محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے یہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں جو معصوم بچوں کو آلہ کار بنا کر اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ یہاں بھیک مانگنے والوں کی سرپرستی کی جاتی اور اپنا حصہ لیا جاتا ہے۔ جیب کتروں کی سرپرستی کی جاتی ہے، انہیں ٹریننگ دی جاتی ہے اور ان کی کمائی سے تھانوں میں منتھلی دے کر اپنا حصہ کمایا جاتا ہے۔ ایسے سنار موجود ہیں جو چوری کا زیور آدھے داموں خرید لیتے ہیں، ہمارے ہاں ایسے قصائی عام مل جاتے ہیں جو چوری کے جانور معمولی قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ ایسے کباڑیے موجود ہیں جو مجبوروں، ضرورت مندوں اور چوری کرنے والوں سے سامان چند ٹکوں کے عوض خرید کر پوری قیمت کے قریب ترین میں فروخت کر دیتے ہیں۔ ناول نگار نے ایک ایسے ہی کردار کے ذریعے ہمارے اس المیے کی نشان دہی کی ہے۔ نیاز کباڑیہ جس کے مکان میں نوشا کی بیوہ ماں کرایہ دار تھی ایک کباڑیہ تھا۔ نوشہ ایک دن مکان کا کرایہ دینے گیا تو نیاز نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ نوشا نے بتایا کہ وہ عبد اللہ مستری کی ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ اب نیاز نے جو کچھ نوشہ سے کہا اُس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بے چارے، غریب، سیدھے سادھے اور ان پڑھ بچے مجرم خود نہیں بنتے بلکہ انہیں مجرم بنایا جاتا ہے۔

ناول نگار نے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ہمارے معاشرے میں جرائم کی تربیت کے لیے جگہ جگہ مواقع ملتے ہیں۔ جو بچہ معمولی چوری کر لیتا ہے یا جھوٹ بولنے کا عادی بن جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ بڑا ہاتھ مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچوں کو غلط ماحول اور آوارہ دوست بھی بڑی سے اتارنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ بے چارے والدین صبح کے نکلے شام کو واپس آتے ہیں اور اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر نظر نہیں رکھ سکتے۔ راجہ جیسے بے سہارا اور نوشا جیسے یتیم اور مجبور بچوں کی تربیت کے لیے ادارے موجود نہیں جو انہیں مفید اور کارآمد شہری بنا سکیں۔ ہمارے معاشرے میں صرف نیاز کباڑیے جیسے نہیں سائیکل مکینک مجید جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بچوں کو مجرم بنا دیتے ہیں۔

پاکستانی اردو ناول میں پسماندگی اور پس ماندہ طبقے کے مسائل پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا لکھا جانا چاہیے تھا یا جتنی زیادہ پس ماندگی ہے۔ اس بات کو محسوس کر کے اسے اپنا موضوع بنایا ہے اور پس ماندہ طبقہ کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

CC BY

حوالہ جات

1۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ (طبع چہارم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2002ء، ص636

2۔ Diana kendall, Sociology in our times, The Essentials (6th edition), Thomson higher education Belmont, USA, 2007, P 4

3۔ James M. Henslin (editor), Down to earth sociology: Indrocucory Reading, (8th edition), The free press, New york (London), 1995, P 504

4۔ مشتاق عادل، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ناول اور طبقاتی کشمکش، ساہیوال: فروغ زبان پبلشرز، 2021ء، ص10

5۔ صلاح الدین احمد، اردو میں افسانوی ادب، مرتب: معزالدین احمد، صریر خامہ (جلد دوم)، المقبول پبلی کیشنز، ص1

6۔ محمد افضال بٹ، محولہ بالا، ص79

7۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص3

8۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، لاہور: فکشن ہاؤس، 2015ء، ص18

9۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص92

10۔ ممتاز شیریں (مضمون)، مشمولہ: اردو ادب کی ترقی پسند تحریک، مرتبہ: احمد پراچہ، لاہور: فکشن ہاؤس، ص4

11۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص138

12۔ پروفیسر محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، 2011ء، ص503

13۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص127

14۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص31

15۔ ایضاً، ص32

16۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، کراچی: کتاب پبلی کیشنز، 2013ء، ص13